سیر و سوانح

احمد اللہ شاہ

۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد

ڈاکٹر اقبال حسین

اٹھارہویں صدی میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلہ مند افراد نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر دیں۔ بلاشبہ یہ حکومتیں طاقت اور وسعت میں مغلیہ سلطنت کی ہم پلہ تو نہ بن سکیں لیکن ان حکومتوں نے مغل حکومت کی روایات کو کم و بیش برقرار رکھا۔ دکن میں ایک ایسی ہی آزاد حکومت کی بنا ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ نے رکھی۔ صوبہ دکن میں کرناٹک کا علاقہ بھی شامل تھا۔ یہاں سعادت اللہ خاں، نظام کی نیابت کر رہے تھے۔ بعد ازاں کرناٹک کے علاقہ پر نظام کا قبضہ نہ رہ سکا۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستیں انگریزی سیاستِ حرب کا شکار ہو چکی تھیں۔ کرناٹک ان کی حکمتِ عملی کا شکار ہوا اور بالآخر ۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے کرناٹک کے نواب کو پنشن دے کر پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے شاہ عالم تخت پر برقرار رکھے گئے لیکن عملاً حکومت کی زمام انگریزوں کے ہاتھ آ چکی تھی۔ اسی دورِ انحطاط میں چیناپٹن (مدراس) میں احمد اللہ[1] شاہ غالباً ۱۷۸۵ء[2] میں پیدا ہوئے۔

۱ـ آپ کے حسب نسب کے متعلق ابرار حسن فاروقی گوپامئوی نے محققانہ بحث کی ہے اور اُن اغلاط کی نشاندہی کی ہے جو بعض سوانح نگاروں نے کی ہیں۔ ابرار حسن فاروقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ احمد اللہ شاہ کے مورث اعلیٰ انوار الدین گوپامئو سے دکن گئے تھے اور بعد ازاں کرناٹک کے نواب ہوئے تھے۔ احمد اللہ شاہ کے والد کا نام سراج الدولہ بہادر تھا لیکن اُن کی والدہ نے محمد علی نام رکھا تھا اور یہی مشہور ہوا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو آثر دلاوری، صفحات ۲ تا ۴۴؛ انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، دہلی، صفحات ۴۴ تا ۵۳۔

۲ـ ابرار حسن فاروقی صاحب نے احمد اللہ شاہ کی آگرہ میں آمد کا سال ۱۸۴۵ء لکھا ہے اور بعض مورخین کے =

احمد اللہ شاہ کے حالاتِ زندگی اُن کے مُرید اور شاعر فتح محمد تائب نے ایک مثنوی میں قلم بند کیے ہیں۔ تائب کی مثنوی ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوئی۔ ممکن ہے تائب نے شاہ صاحب کی وفات کے بعد ہی مثنوی مکمل کر لی ہو لیکن حالات زمانہ کی وجہ سے فوراً عام نہ ہو سکی ہو۔

احمد اللہ شاہ جس گھرانے کے چشم و چراغ تھے وہاں روایتی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ شاہ صاحب کو بھی رسم زمانہ کے مطابق عربی، فارسی کی تعلیم کے علاوہ، اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق کی تعلیم دی گئی۔ دریں اثنا فن سپہ گری بھی سیکھتے رہے، تعلیم مکمل کی تو اہلِ سیف و قلم دونوں تھے۔ آخر الذکر کا ثبوت ہمیں نہیں ملتا کیونکہ شاہ صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ملتی لیکن ان کی وعظ کی مجلسیں اور علما سے بحث و گفتگو، شہادت دیتے ہیں کہ موصوف کو خاص علمی مقام حاصل تھا۔ بہر نوع تعلیم کے دوران ہی غالباً احمد اللہ شاہ نے انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور یہ زیادہ قرین قیاس بھی ہے۔ کیوں کہ کرناٹک کے علاقہ میں عیسائی مُبلغوں کے زیرِ اثر انگریزی زبان رواج پا رہی تھی۔ تحصیل علم کے بعد احمد اللہ شاہ، غالباً نظام حیدر آباد کی دعوت پر حیدر آباد تشریف لے گئے[1] اور نظام کی فوج میں ملازمت کر لی۔ قرب و جوار کے سرکش زمین داروں اور مرہٹوں کے خلاف کئی جنگوں میں شریک ہوئے اور کامیابیاں حاصل کیں[2]۔ تائب کے بیان کے مطابق شاہ صاحب کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی اور نظام سے قربت کی وجہ سے حیدر آبادی امرائے ریشہ دوانیاں کیں جس کی بنا پر آپ کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا[3]، لیکن بعض برطانوی افسران، شاہ صاحب کی اہلیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کو انگلینڈ جانے کی اجازت دے دی۔ بقول تائب ابھی شاہ صاحب حیدر آباد ہی میں تھے کہ رئیسانِ لندن کو اُن کی آمد کی اطلاع مل گئی[4]۔ بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کہ احمد اللہ شاہ واقعی لندن

= مطابق اُس وقت آپ کی عمر ۶۰ سال کی تھی۔ شہادت ۱۸۵۸ء میں ہوئی تو آپ تہتر سال کے تھے اس طرح سن پیدائش ۱۷۸۵ء ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو آثر دلاوری، ص ۸۰

[1] تائب، ص ۳۲ [2] ایضاً [3] تائب نے تفصیل دی ہے، ملاحظہ ہو صفحات ۳۱ تا ۳۲ اور ۴۹

[4] تائب، ص ۱۰۸۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب احمد اللہ شاہ اودھ میں سرگرم عمل تھے، انگریزوں کو اُن کے متعلق کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اگر احمد اللہ شاہ لندن گئے ہوتے تو برطانوی حکمرانوں کو ان کے متعلق پوری معلومات ہوتیں اور انگریز مورخین کو جن میں سے اکثر فوجی افسر تھے اور جو اُس زمانہ میں انتظامیہ =

گئے تھے یا نہیں، تاہم تائب کا یہ بیان بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے مسلم ممالک کا سفر کیا اور اسی دوران حج بیت اللہ اور حاضری مدینہ منورہ سے بھی سرفراز ہوئے۔ ہندوستان واپس ہوئے تو شخصیت بدل چکی تھی۔ سانبھر (راجستھان) کے صوفی بزرگ سید فرمان علی شاہ[۱] کے مرید ہو گئے۔ پیر کے مشورہ پر گوالیار تشریف لائے۔ یہاں ایک دوسرے صوفی بزرگ محراب علی[۲] شاہ سے ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ محراب علی شاہ نے احمد اللہ شاہ کو دیکھتے ہی فرمایا:۔

"میاں میں تو تمہارا عرصے سے منتظر ہوں اور جو امانت بزرگوں سے لیے بیٹھا ہوں اس کی سپردگی کا وقت آگیا ہے۔ بیعت تو کرتے ہو مگر جان کی بازی لگانی ہوگی۔ سودا بڑا کٹھن ہے۔"[۳]

احمد اللہ شاہ نے جواب دیا کہ جو مرشد کا حکم ہوگا اس کی بسر و چشم تعمیل ہوگی۔

محراب علی شاہ نے احمد اللہ شاہ کو جہاد کی تلقین فرمائی۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے چند برس پہلے سید احمد شہیدؒ بھی مجاہدین کی جماعت کے ہمراہ گوالیار تشریف لائے تھے اور وہاں کے حکمراں سندھیا راؤ سے انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے مدد مانگی تھی۔ ہر چند کہ سید احمد شہید کی بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں شہادت کے بعد اُن کی تحریک کو زبردست صدمہ پہونچا تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شمالی ہند کے علاوہ دکن، گجرات اور مدراس تک سید احمد شہید کی تحریک کے نتیجہ میں مجاہدین کی جماعت سرگرم عمل تھی۔ گوالیار میں محراب علی شاہ کی احمد اللہ شاہ کو جہاد کی تلقین اس

= بھی چلا رہے تھے اتنی لاعلمی نہ ہوتی کہ وہ ان کو فیض آباد کا مولوی کہتے۔ بہر حال تائب کے بیان کو غلام رسول مہر (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص۲۶۳) شہابی، (صفحات ۱۸-۱۹) ایوب قادری (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) اور معین الحق (The Great Rivolution of 1857) تسلیم کرتے ہیں (آئندہ بحوالہ معین الحق)

۱؎ مولوی ابرار حسن فاروقی لکھتے ہیں کہ آپ کے بزرگوں کو مغل بادشاہوں سے گذر اوقات کے لیے مدد معاش حاصل تھی۔ کچھ دنوں تک فرقان علی شاہ نے جے پور کے مہاراجہ کے یہاں ملازمت بھی کی بعد ازاں ناگور کے صوفی بزرگ شاہ حفیظ اللہ سے بیعت ہو گئے۔ میراث احمدی صفحات ۳۲۲ تا ۳۲۷۔ معین الحق صاحب نے لکھا ہے کہ بہت سے لوگ فرمان علی شاہ کو قربان علی شاہ لکھتے ہیں جو غلط ہے۔ معین الحق ص۵۔ ۲؎ محراب علی شاہ گوالیار میں ایک مرہٹہ سردار کی فوج میں ملازم تھے۔ شہابی ص۱۹ ۳؎ شہابی ص۱۹۔ تائب نے احمد اللہ شاہ اور فرمان علی شاہ کی ملاقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تائب صفحات ۱۳۵ تا ۱۴۰۔

بات کی دلالت کرتی ہے کہ محراب شاہ بھی سید احمد شہید کی تحریک کے ایک رکن تھے۔ پیر کی ہدایت پر احمداللہ شاہ بھی تحریک میں شامل ہوگئے، کچھ دنوں بعد ایک تعارفی خط کے ساتھ مفتی انعام اللہ وکیل سرکار آگرہ کے پاس پہونچے۔ انعام اللہ صاحب کا مسکن اہلِ علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان میں مولوی کریم اللہ صدر الصدور، مولوی قاسم داناپوری، مولوی غلام امام امیٹھوی، مولوی امام بخش، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، محمد شفیع اللہ آبادی، مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین، محمد باسط علی، مولوی معین الدین، مولوی شفیع، اعتقاد علی، مرزا اسد علی بیگ، سید باقر علی، مفتی عبدالوہاب گوپامئوی، مولوی نورالحسن، اسعد رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیرآبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں[۱]۔ کہا جاتا ہے کہ احمداللہ شاہ کی رہائش گاہ کے پھاٹک پر دن میں پانچ بار نوبت[۲] بجتی تھی۔ احمداللہ شاہ کے گھر پر سماع کی محفلیں جمتی تھیں اور غالباً یہ ایک ذریعہ تھا سرکردہ مسلمانوں سے ملاقات کا۔ اس کے علاوہ احمداللہ شاہ باقاعدگی سے وعظ بھی فرماتے تھے جس میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور مسلمان شریک ہوتے تھے۔ ہر شنبہ کو تیر و تفنگ کی مشق میں بھی حصہ لیتے تھے[۳]، یہ ایک فعل تھا جو بظاہر احمداللہ شاہ کی فقیرانہ زندگی کے برعکس تھا۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی سرگرمیوں پر حکومت کی نظر تھی۔ آپ آگرہ سے دوبارہ گوالیار لوٹ آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی حکومت اودھ پر قبضہ کرنے کو تیار بیٹھی تھی اور اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے بڑی حد تک کرنل سلیمن کا بھی ہاتھ تھا۔ کرنل سلیمن نے اودھ کے تقریباً تمام علاقوں کا دورہ کرکے ایک تفصیلی رپورٹ لارڈ ڈلہوزی کو دی تھی[۴]۔ سلیمن کی رپورٹ کا مطالعہ کیجئے تو یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے کہ اس شخص نے اپنی قوم کے لیے کتنی محنت اور لگن کے ساتھ اودھ کے تعلقہ داروں کی مالی، فوجی اور سماجی حالت کا جائزہ لیا تھا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اودھ پر قبضہ سے پہلے اودھ کے تعلقہ داروں کی مدافعانہ قوت کا پورا احوال سامنے ہو، تاکہ بغاوت کی صورت میں اُن کی جلد سے جلد سرکوبی کی جا سکے۔ بہرحال سلیمن کی رپورٹ آنے کے بعد ہی اودھ کے آخری نواب کو معزول کر دیا گیا اور

۱؎ شہابی، ص۲۲۔ ۲؎ خوارق مستان، بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، صفحات ۵۳۰-۵۳۱
۳؎ شہابی، صفحات ۲۲-۲۳
۴؎ یہ رپورٹ کتابی شکل میں 'Journey Through the Kingdom of Oudh' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

پورے صوبہ میں انگریزوں کا بغیر جنگ وجدال کے قبضہ ہوگیا۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ ایک المیہ تھا لیکن حکومت کے خاتمہ سے ایک سال پہلے مولوی سید امیر کی ہنومان گڑھی کے قضیہ پر "جہاد" کرتے ہوئے جس انداز میں مولوی صاحب کو شہید کیا گیا تھا[۱]۔ اس نے اودھ کے علاوہ دور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں کو برہم کر دیا تھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ کی زندگی کا مشن ہی جہاد تھا، آپ مولوی امیر علی شہید کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے لکھنؤ پہونچے[۲] احمد اللہ شاہ کے ہمراہ اور کتنے لوگ تھے اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ احمد اللہ شاہ کس ماہ وسن میں لکھنؤ پہونچے تھے۔ لکھنؤ کا ایک موقر ہفتہ وار اخبار طلسم، جس کی ادارت کے فرائض مولوی یعقوب فرنگی محلی کر رہے تھے، اپنی ۲۱ رنومبر ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں شاہ صاحب کے بارے میں لکھتا ہے:۔

> "ان دنوں ایک شخص احمد اللہ شاہ نامی لباس میں فقیروں کے مگر ٹھاٹھ سب امیروں کے اس شہر میں وارد ہوئے۔ معتمد الدولہ کی سرا میں اونرے۔ اب جلئے قیام گھسیاری منڈی ہے۔ سبزہ ہے ہوا ٹھنڈی ہے۔ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو وہاں مجمع کثیر ہوتا ہے۔ شہر کا برونا پیر ہوتا ہے۔ مجلس حال قال کے ہوتی ہے لیکن نئی چال کی ہوتی ہے"[۳]

طلسم کی اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ لکھنؤ میں بھی احمد اللہ شاہ نے وہی طریقہ جاری رکھا جو آگرہ میں تھا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اسی دوران لکھنؤ میں ایک دوسرے بزرگ نے بھی اس اندازِ مجذوبیت سے عوام میں بہت مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اُن کے مسکن پر بھی کثیر مجمع ہوتا اور ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا۔ وہ مجمع کے سامنے کہا کرتے کہ "بے

۱؎ مولوی امیر علی کی حیات اور کارناموں کے لیے ملاحظہ ہو، رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ صفحات ۲۹۔۳۰، نجم الغنی، تاریخ اودھ، حصہ پنجم، صفحات ۲۰۹ تا ۲۳۰، ہنومان گڑھی کے واقعہ کے لیے ملاحظہ ہو، مرزا جان، حدیقۃ الشہدار، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۷۲ھ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت دنوں تک یہ کتاب سرکاری عتاب کا شکار رہی۔

۲؎ جان پیمبل کو غالباً سہو ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ ملتان سے لکھنؤ آئے تھے۔ ملاحظہ ہو *The Raj, the Indian Mutiny and the Kingdom of oudh 1801–1857* مطبوعہ ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۱

۳؎ تاریخ اودھ، جلد پنجم، ص ـــــ

۴؎ طلسم، ۲۱ رنومبر ۱۸۵۶ء نمبر ۱۸، جلد نمبر ۱، صفحہ اول۔

استرداد حکومت (اودھ) یہاں سے نہ جاؤں گا، بادشاہ کو تخت پر بٹھاؤں گا[1] غرض یہ کہ وہ احمداللہ شاہ ہوں یا کوئی اور مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جو آگ سلگ رہی تھی وہ مختلف انداز میں عوام کے سامنے آرہی تھی۔ اسی زمانے میں مولوی فضل حق خیرآبادی[2]، لکھنؤ میں صدرالصدور کے عہدہ پر فائض تھے۔ واضح رہے کہ مولوی فضل حق بہت خوش حال، متمول اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ان کی طرز زندگی بھی امیرانہ تھی، کہا جاتا ہے کہ مولوی فضل حق اور مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی نے مولوی سید امیر علی شہید کی تحریک جہاد برائے مسجد ہنومان گڑھی، کے خلاف فتویٰ دیا تھا[3] احمداللہ شاہ وارد لکھنؤ ہوئے اور اُن کا شہرہ بلند ہوا تو مولوی فضل حق خیرآبادی بھی ملنے پہونچے۔ خدا جانے دوران گفتگو احمداللہ شاہ کا کیا اثر ہوا کہ مولوی فضل صدرالصدوری[4] سے مستعفی ہوکر الور چلے گئے۔ ان کا قلب بدل چکا تھا۔ اب وہ انگریزوں کے ہمنوا نہیں بلکہ شدید دشمن بن چکے تھے۔ مولوی فضل حق نے الور کے مہاراجہ کو غالباً جہاد میں شریک ہونے کے لیے آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ بہرحال اب وہ ایک پرجوش "جہادی" بن چکے تھے۔

احمداللہ شاہ کی لکھنؤ میں سرگرمیوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو دعوتِ جہاد ہی دینا تھا۔ احمداللہ شاہ نے اس کے لیے وہی پرانا نسخہ مجلس حال وقال کا استعمال کیا لیکن وہ جس شہر میں جہاد کی تلقین کر رہے تھے وہاں مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسے طبقہ کی تھی جس کا عقیدہ تھا کہ جہاد کا فتویٰ صرف امام ہی دے سکتا ہے۔ بہرحال شاہ صاحب کی مساعی کا نتیجہ نکلنا شروع ہوا

---

[1] طلسم ۵ دسمبر ۱۸۵۶ء، نمبر ۲، جلد نمبر ۱، صفحہ اول کمال الدین حیدر احمداللہ شاہ کو فقیر مندراج یا دکن کا لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کئی برس سے لکھنؤ میں گھسیاری منڈی میں رہتے تھے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نقارہ شاہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ تواریخ اودھ، جلد دوم ص ۲۰۳

[2] حیات وکارناموں کے لیے ملاحظہ ہو، شاہد خاں شیروانی۔ دیباچہ باغی ہندوستان (ترجمہ الثورۃ الہندیۃ تالیف مولوی فضل حق، شہابی، مسہر وغیرہ

[3] شہابی، صفحہ ۶۵، ہنومان گڑھی کی مسجد کے قضیہ کے متعلق ابتدا سے آخر تک کے حالات کمال الدین حیدر نے لکھے ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تواریخ اودھ، جلد دوم، صفحات ۱۰۸ تا ۱۲۷۔ فتویٰ کے متعلق ملاحظہ ہو ص ۱۲۵۔

[4] ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'Fazl-e-Haq of Khairabad-a rebel Scholar of 1857'، پروسیڈنگ انڈین ہسٹری کانگریس، گوا۔

اور اُن کے پیروؤں کی تعداد دن بہ دن بڑھنے لگی۔[۱] احمداللہ شاہ کی سرگرمیاں محکمہ سراغرسانی سے مخفی نہ تھیں۔ شہرکوتوال کو حکم ہوا کہ شاہ صاحب کو جہاد کی تبلیغ سے روک دیا جائے۔ شاہ صاحب نے اپنے مشن کو ترک کرنے سے انکار کر دیا۔[۲] شاہ صاحب اپنے وعظ میں اکثر مولوی امیر علی شہید ہنومان گڑھی کی قربانیوں کا ذکر کرتے اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خدا جانے محکمہ سراغرسانی کی رپورٹ پر یا بعض بااثر حضرات کی شکایت پر، جو شاہ صاحب کی تحریک جہاد کے مخالف تھے، شہرکوتوال کو ہدایت کی گئی کہ شاہ صاحب کی نگرانی کی جائے۔[۳] احمداللہ شاہ غالباً اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کا عظیم مشن ناکام ہو جائے اور حکومت وقت کی نگاہ میں اُن کے رفقاء آکر غیر ضروری صعوبتوں کا شکار ہوں۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ سے ہجرت کر دی اور بہرائچ کا رخ کیا جہاں صدیوں پہلے سید سالار مسعود غازی جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ اُن کی رفاقت میں چند افراد تھے۔ فیض آباد پہونچے اور چوک کی سرائے میں قیام فرمایا۔ یہاں بھی جہاد کی تلقین میں مصروف ہوئے۔ آمد کے تیسرے دن گرفتاری کا پروانہ آپہونچا۔ آپ کو اور دیگر رفقاء کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ شاہ صاحب اور اُن کے رفقاء نے مدافعت کی۔ سخت معرکہ کے بعد شاہ صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور سرسری مقدمہ کے بعد فیض آباد کی جیل میں محبوس کر دیا گیا۔

شاہ احمداللہ شاہ کی تحریک جہاد کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ شاہ صاحب کے ذہن میں تحریک کا پورا نقشہ رہا ہوگا، وہ جابجا بلامقصد نہیں پھر رہے تھے۔ کپتان ٹی آر ہیچنسن (Hutchinson) لکھتا ہے:-

> "یہ شخص (احمداللہ شاہ) ہماری عملداری میں بہت سے شہروں اور علاقوں سے گذرتے ہوئے، ہندوستان کے ہر حصے میں اپنے مرید بناتے ہوئے، فروری ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ پہونچا، بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ لوگوں کو جہاد پر کافروں

---

[۱] تائب کے بیان کے مطابق ہزاروں کی تعداد میں تلنگے حاضر ہونے لگے۔

[۲] تائب لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے منصوبہ بنایا تھا کہ کسی اتوار کو اچانک گرجا گھر پر حملہ کرکے عیسائیوں کو ہلاک کر دیا جائے لیکن ان کے رفقاء کی کوتاہی سے منصوبہ ناکام ہو گیا اور حکومت بھی آگاہ ہو گئی۔ تائب ص ۱۸

[۳] طلسم، لکھنؤ، نمبر ۲۸، مورخہ ۳۰ جنوری و ۲۷ فروری ۱۸۵۷ء، سحر سامری، نمبر ۱۷، مارچ ۱۸۵۷ء

یا بدعقیدوں کے خلاف مذہبی جنگ، جیسا کہ یورپین تصور کرتے ہیں، آمادہ کیا۔"[۵۱]

احمد اللہ شاہ ابھی جیل ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہوگئی۔ میرٹھ، بریلی، شاہجہاں پور، بدایوں دہلی کی طرح فیض آباد اور لکھنؤ میں بھی بغاوت ہوگئی۔ اودھ کی حکومت کی معزولی اور علاقہ کے انتزاع کے بعد پورے علاقہ میں انگریزوں کے خلاف جو آتش فشاں دبا ہوا تھا وہ پھوٹ پڑا۔ اودھ میں بغاوت کے سیاسی اسباب کے علاوہ اقتصادی سبب خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ واجد علی شاہ کی حکومت سے برطرفی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دربار ختم ہوگیا، امراء کی ضرورتوں میں فرق آگیا، واجد علی شاہ کی فوج میں ملازم سپاہ اور اعلیٰ افسران بے کار ہوگئے، دربار، بادشاہ، امراء اور سپاہ کی ضرورتوں کو فراہم کرنے والے دستکار اور ہنرمندانِ اودھ روزی روٹی کو ترسنے لگے۔ معزولی حکومت کے اثرات صرف اودھ تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ اودھ سے دور، اعظم گڑھ کے بنکروں کی اقتصادی حالت پر جو اثر ہوا تھا اس کا اندازہ، طلسم لکھنؤ کی اس خبر سے کیا جاسکتا ہے:۔

"صاحب مجسٹریٹ بہادر نے سنا کہ مبارک پور (اعظم گڑھ) کے جولاہے نکلے جاتے ہیں۔ بہت لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر ادھر اودھر چلے جاتے ہیں۔ صاحب نے یہ سن کر تفتیش سبب کی...... تھانہ دار نے لکھا کہ جولاہے فاقہ کشی میں گرفتار ہیں۔ اس لیے یہاں کے رہنے سے بیزار ہیں...... ہزار جولاہے لڑکے بالوں کو لے کر کعبہ شریف کی طرف راہی ہوئے۔ لکھنؤ میں کپڑے کی خریداری نہ رہی۔ اونکے لیے صورتِ اوقات گذاری نہ رہی۔ مصارف کے متحمل نہوئے۔ کام نہ چلا۔ آپ چلے گئے۔"[۵۲]

خود اودھ کا بُرا حال تھا، کمال الدین حیدر، ایک ہم عصر مورخ لکھنؤ کے متعلق رقم طراز ہے:۔

"اس شہر میں ہزاروں بیکار و معطل خانہ نشین ہیں۔ ان سب کی تلاشِ معاش بھی مختلف ہے۔ بہت بُرا وہ شہر ہے جہاں کسی پیشے یا تجارت کی قدر نہ ہو یا وہاں کے لوگ

---

۵۱ Narrative of the Mutinies in Oudh, Calcutta, 1859, P.292

یہاں یہ امر قابل وضاحت ہے کہ کپتان ہیچنسن کی یہ اطلاع درست نہیں ہے کہ شاہ صاحب فروری ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ پہونچے، طلسم، لکھنؤ اپنی ۲۱ نومبر ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں شاہ صاحب کی لکھنؤ میں آمد کی خبر دیتا ہے۔

۵۲ طلسم، لکھنؤ، نمبر ۶، مورخہ ۲۹ اگست ۱۸۵۶ء، ص ۹

کسی کسب یا پیشے کو خلاف اپنی شان کے سمجھیں جس طرح دستور ہر ولایت کا ہے کہ
ہندوستان میں بھی قلیل وکثیر پر تجارت تھی جس طرح علی آباد کا سلم سب ولایت
میں جاکر بکتا تھا، تاجران لکھنؤ کو دوچند سہ چند نفع ہوتا تھا۔ اسی طرح جن کے پاس
بضاعت قلیل تھی اسی تجارت سے صاحب مال چند روز میں ہو گئے تھے۔ وہ
تجارت بھی یک قلم موقوف ہوگئی۔ ولائتی کپڑے کے آنے سے باقی تجارت خاص
اشیاء جزئیات کی رہ گئی۔ اوسکی بھی کثرت سے قدر قیمت جاتی پھر تلاش معاش منحصر
فقط نوکری پر رہ گئی وہ بھی اس زمانے میں جاتی رہی۔ اب اس زمانے میں فقط تعلیم
زبان انگریزی کی رہ گئی وہ بھی چند روز میں بسبب کثرت بہت سستی ہوجائیگی۔ ازروئے
حساب جغرافیہ مملکت تمام اودھ میں تین (غالباً تیس) ملین فی دس لاکھ آدمی تھے حضرت
خلد منزل کے عہد دولت میں جنرل لوصاحب فرماتے تھے کہ دس لاکھ فقط اس شہر میں
ہیں۔ اونمیں غالب ہے، (کہ) اب تین لاکھ سے زیادہ نہوں۔ ہزاروں مر گئے، ہزاروں
آوارہ وطن ہوئے، ہزاروں جو مجبوری رہ گئے ہیں محتاج نان شبینہ کے ہیں علاوہ اس
کے ہزاروں نے شغل بیکاری سے استعمال افیون اختیار کیا ہے[1]۔"

جہاں بیکاری، غربت اور کساد بازاری کا یہ عالم ہو، اور عوام میں یہ احساس جاگزیں ہو کہ ان کی پس ماندگی اور غربت کے کون لوگ ذمہ دار ہیں، ایسے ماحول میں مولوی احمد اللہ شاہ کی تحریک جہاد کو پھلنے پھولنے کے کافی مواقع تھے، چنانچہ فیض آباد میں بغاوت میں سرگرم وہ حضرات تھے جو جہاد کے لیے تیار تھے۔ ان میں اچھی خاصی تعداد ان مجاہدین کی بھی تھی جو سید امیر شہید کی تحریک کے ساتھ تھے۔ فیض آباد میں مجاہدین کے ساتھ فوج کے سپاہیوں نے جیل پر حملہ کرکے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان میں احمد اللہ شاہ بھی تھے[2]۔ بقول کمال الدین حیدر:-

"پہلے فوج نے چاہا کہ اسے (احمد اللہ شاہ) کو اپنا افسر کریں، ہمارا سرپرست ہو لیکن
اس کی باتوں سے ڈرے کہ ہندو سے بہت بیزار اور نفرت رکھتا ہے اکثر انتقام

---

[1] تواریخ اودھ جلد دوم صفحات ۵۱-۵۲۔ ایک اور جگہ کمال الدین نے لکھا ہے کہ ۸۷ ہزار آدمی جن کی تنخواہ تراسی لاکھ روپئے میں ادا کی جاتی تھی برطرف ہوئے۔ تواریخ اودھ، جلد دوم صفحہ ۱۷۰
[2] جے، ریڈ، میمورنڈم مورخہ ۸ رجون ۱۸۵۷ء، بحوالہ رضوی، جلد دوم، صفحہ ۳۵۰

ہنومان گڑھی کو بھی کہتا ہے، مُبادا اسکی جہت سے پھر ہندو و مسلمانوں میں صورت
فساد نکلے اس جہت سے افسر نہ کیا"۔ ۱؎

کمال الدین حیدر کے پورے بیان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد اللہ شاہ کی قیادت فوج کو قابلِ قبول تھی۔ بہر حال کمال الدین حیدر نے کمال ہوشیاری سے اپنے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ احمد اللہ شاہ ہند و بیزار تھے۔ احمد اللہ شاہ کی سابق زندگی، آگرہ میں اُن کی وعظ کی مجلسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی شرکت، بہر حال کمال الدین حیدر کے بیان کی نفی کرتی ہے۔ اس ضمن میں تاثب کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ بغاوت کے بعد فوج نے شاہ صاحب کو اپنا قائد بنا لیا تھا لیکن راجہ مان سنگھ ۲؎ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ راجہ مان سنگھ کے کردار کے بارے میں گبنس (Gubbins) لکھتا ہے :-

"یہ انتخاب (راجہ کی قیادت) خوشگوار نہ تھی کیونکہ وہ غدار ثابت ہوا۔ اس چالباز برہمن نے ہندوستانی افسران کو بہکایا، پُھسلایا اور دھمکایا۔ اپنے بھائی رام دین کو نانا کے پاس ایک مہم پر بھیجا۔ دریں اثنا خفیہ ایجنٹس کے ذریعہ اُس نے ہم لوگوں سے خط و کتابت جاری رکھی"۔ ۳؎

۱؎ تواریخ اودھ، جلد دوم، صفحات ۲۰۳ ــــ ۲۰۴

۲؎ راجہ مان سنگھ، بختاور سنگھ کا بھتیجہ (برہمن سنکلدیپ) بکسر (بہار) کا اصل باشندہ تھا۔ بختاور سنگھ ہکیٹی کی گھڑ سوار فوج میں ملازم تھا، سعادت خاں اُسے اودھ لائے اور ترک سوار فوج کا کماندار بنا دیا۔ اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے وہ دن بہ دن ترقی کرتا رہا۔ بہار سے اُس کے اعزہ بھی آ گئے۔ بیشتر محکمہ مالیات میں ملازم ہو گئے۔ ان لوگوں نے اجودھیا کے گرد و نواح میں زمیندارانہ حقوق حاصل کر لیے۔ ہنومان گڑھی کے قضیہ کو بڑھانے میں بختاور سنگھ اور مان سنگھ کا بڑا ہاتھ تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، بہادر سنگھ بھٹناگر، یادگار بہادری، قلمی، بلرام پور (گونڈہ) اسٹیٹ لائبریری ص ۶۰۵، مرزا جان، حدیقۃ الشہداء، برائے قضیہ ہنومان گڑھی۔ کمال الدین حیدر لکھتے ہیں کہ باغیوں نے قیادت مان سنگھ کو سونپ دی۔ تواریخ اودھ، حصہ دوم، ص ۲۰۴ (آئندہ، بحوالہ کمال الدین حیدر)۔ Mathison لکھتا ہے کہ مان سنگھ تعلقہ دار اودھ بغاوت سے چند دنوں پہلے قید میں تھا لیکن کیٹس الگزینڈر ار کی سفارش پر اُسے رہا کر دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو، 'A History of Indian Mutiny' Vol. III P 267 - Mallison بحوالہ آئندہ

۳؎ 'An Account of the Mutinies in Oudh' M.R. Gubbins - ۲۰۵

بہرحال شاہ صاحب کے خلاف مان سنگھ کی کامیابی کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہے کہ بقول تائب زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد شاہ صاحب نے اُن مناور کے انہدام کے احکامات جاری کر دیے جو مساجد شہید کر کے تعمیر کیے گئے تھے[۱] چونکہ فوج میں کثرت اہلِ ہنود کی تھی، شاہ صاحب کے احکامات کو غلط رنگ دے کر، مان سنگھ نے قیادت حاصل کر لی۔

افسوس ہے کہ بغاوت کے آغاز ہی میں طلسم کی اشاعت بند ہو گئی۔ اگر اس اخبار کی اشاعت جاری رہی ہوتی تو ہمیں لکھنؤ اور اطراف وجوانب میں جاری انگریز مخالف سرگرمیوں کے متعلق زیادہ معلومات فراہم ہوتیں۔ بہرحال احمد اللہ شاہ فیض آباد سے لکھنؤ کے لیے عازم سفر ہوئے۔ ہر چند کہ باغی فوج کی اکثریت راجہ مان سنگھ کی رفاقت میں فیض آباد مقیم تھی، شاہ صاحب کی معیت میں مجاہدین کا ایک دستہ تھا۔ شاہ صاحب کی فیض آباد سے روانگی کے بعد ہی راجہ مان سنگھ کی دوہری شخصیت باغیوں کے سامنے بے نقاب ہو گئی، لیکن مصلحتاً فوج نے اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا[۲] باغی دوبارہ شاہ صاحب سے جا ملے[۳] احمد اللہ شاہ اب ایک بڑی جمعیت کے ساتھ لکھنؤ کے قریب واقع موضع چنہٹ پہونچے۔ کمپنی کے افسران کو اطلاع مل چکی تھی کہ تقریباً ۱۵ ہزار باغی فوج لکھنؤ کے قریب آ چکی ہے، چنانچہ کپتان ہنگنس بارلو کی قیادت میں انگریزی فوج باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی[۴] احمد اللہ شاہ اور ان کے رفقاء نے انگریزی فوج کو ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو شکست فاش دی[۵] شاہ صاحب اس معرکہ میں زخمی ہو گئے تھے[۶] بہرحال شاہ صاحب اُسی عالم میں اپنے مجاہدین کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھی اور اُسی دن لکھنؤ داخل ہو کر دریائے گومتی کے کنارے واقع رصدگاہ

---

[۱] تائب، صفحات ۵۹-۵۸ [۲] کمال الدین حیدر، دوم، صفحہ ۲۱۲

[۳] تائب، صفحہ ۱۶ [۴] کمال الدین حیدر، دوم صفحہ ۲۱۲

[۵] کمال الدین حیدر، دوم، صفحہ ۲۱۲، تائب صفحات ۶۲-۵۹

[۶] کمال الدین حیدر، دوم، صفحہ ۲۱۳، تمسخرانہ انداز میں لکھتا ہے "احمد اللہ شاہ راہ میں بہت سرگرم عمل تھا۔ پانوں میں گولی لگی۔ بہت فخر ومباحات اپنی تیغ وبہادری کرتا تھا"۔ تائب صفحات ۶۳-۶۲۔ جنگ میں شاہ صاحب اور اُن کے رفقاء کی بے پناہ جراءت وبہادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ موصوف کو ریذیڈنسی کے محاصرہ کے دوران گولی لگی تھی۔

کی کوٹھی میں مقیم ہوئے[1]

اور شہروں کی طرح لکھنؤ میں بھی باغی افواج کے ہمراہ ایسے عناصر داخل ہو چکے تھے جن کا مقصد لوٹ مار تھا۔ شاہی خاندان کے علاوہ دوسرے متمول افراد اس لوٹ مار کا خاص نشانہ بن رہے تھے[2] وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی کہ شہر میں امن و امان قائم ہو اور عوام میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ بدقسمتی سے لکھنؤ میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جو یہ کام بخوبی انجام دے سکتا۔ قیادت کا مسئلہ بھی سامنے تھا۔ کئی دنوں کے بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر لکھنو کے امراء نے برجیس قدر کی مسند نشینی پر اتفاق کیا[3] باغی حکومت قائم کی گئی[4] سرفہرست راجہ جے، سکھ لال اور موخاں تھے۔ فہرست میں شرف الدولہ کو تیسرا مقام ملا۔ احمداللہ شاہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شرف الدولہ کا تقرر بھی بارگراں تھا کیونکہ مذہبًا ان کا مسلک جداگانہ تھا[5] لیکن مخالفت کو نظرانداز کر دیا گیا کیونکہ شرف الدولہ ایک لائق اور سمجھ دار شخص تھے جس کی حکومت کو ضرورت تھی۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ برجیس قدر کی مسند نشینی کے مسئلہ پر احمداللہ شاہ اور ان کے رفقاء کو نظرانداز کیا گیا۔ تائب کا بیان یہاں قابل توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب لکھنؤ میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو عوام پریشان ہوگئے۔ شاہ صاحب نے تہدیدی طور پر اپنی کنارہ کشی کا اعلان کر دیا تھا۔ دوسری طرف موخاں نے سازش کر کے حضرت محل کے ایماء سے برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاہ صاحب کو اس اعلان سے تکلیف پہونچی کیونکہ برجیس قدر کی عمر صرف ۱۲، ۱۳ سال کی تھی اور وہ حالات کے پیش نظر اتنی بڑی ذمہ داری کے اہل نہ تھے[6] شاہ صاحب خوب سمجھتے تھے کہ برجیس قدر کے پردے میں عنانِ حکومت موخاں کے ہاتھ میں ہوگی۔ وقت

۱۔ کمال الدین حیدر، جلد دوم، صفحہ ۲۱۳ ۲۔ ایضًا صفحہ ۲۲۵-۲۱۸ ۳۔ صفحہ ۲۵-۲۲۳

۴۔ سید اطہر عباس رضوی، مرتب Freedom struggle in U.P. Vol. II صفحہ ۱۰۴

۵۔ کمال الدین حیدر، جلد دوم، صفحہ ۲۲۸ پر لکھا ہے کہ شرف الدولہ کے تقرر پر جواہر علی خاں اور موخاں نے اعتراض کیا کہ سنی مسلمان کو نائب کا عہدہ دینا مناسب نہیں ہے۔

۶۔ تائب کا شعر صفحہ ۶۴ پر احمداللہ شاہ کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے:-

کوئی کھیل شاید مقرر کیا | کہ ایک طفل ناداں کو افسر کیا

کا تقاضا یہ تھا کہ قیادت کسی ذی ہوش، باصلاحیت، جنگی تجربہ رکھنے والے فرد کے ہاتھ میں ہو، لیکن بدقسمتی سے اودھ کے نام نہاد مخلصان حکومت اقتدار کی جنگ میں مبتلا ہو کر پوری تحریک کو کمزور کر رہے تھے۔ اس ضمن میں T. H. Kavangarh کا بیان قابل توجہ ہے:-

"ان حالات میں صرف ایک ایسا شخص موجود ہے جو عوام کی مدد کر سکتا ہے۔ ہمیشہ اس کا متمنی رہنے والا یہ شخص (احمداللہ شاہ) کہ اسے حکومت کا سربراہ تسلیم کر لیا جائے (لوٹ مار کرنے والے) فوجیوں کو متنبہ کیا کہ وہ باز رہیں۔ تھانے قائم کیے اور زبردست تادیبی فوج مقرر کی تاکہ امن و امان قائم ہو اور اُس کے احکام پر عمل ہو۔ اُس نے اعلان کیا کہ اُن شہریوں کو قتل کر دیا جائے گا جو لوٹ مار کے مرتکب ہوں گے اُس نے رصدخانہ کی کوٹھی میں قیام کیا اور ایک بادشاہ کی طرح رہنے لگا۔"[۱]

کوینگر کا بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شاہ صاحب کی انتظامی امور میں دلچسپی، تھانوں کا قیام، لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی دھمکی، نئی اودھ حکومت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ شاہ صاحب کے خلاف سازش شروع ہوئی اور ان کی فوج کے ایک حصہ کو اُن کے خلاف اکسا دیا گیا۔ شاہ صاحب کو رصدگاہ کی کوٹھی چھوڑنی پڑی، لیکن گھڑسوار فوج کی مدد سے جس میں سنی مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ دوبارہ رصدگاہ کی کوٹھی میں اقامت پذیر ہو گئے۔[۲]

احمداللہ شاہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں غدر کے فوراً بعد کی صورت حال کا تقاضا تھا کہ بیلی گارد، جہاں انگریزوں نے پناہ لے رکھی تھی فوراً خالی کرا لیا جائے۔ لیکن نااتفاقی کی وجہ سے باغی فوج اپنی قوت خودانیوں کو کمزور کرنے میں ختم کر رہی تھی۔ بہرحال بیلی گارد پر حملہ کی ہسٹری، ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو باغیوں نے بیلی گارد کا محاصرہ کر لیا۔[۳] احمداللہ شاہ اور اُن کے مجاہدین جن کی قیادت برکات احمد کر رہے تھے اس معرکہ میں شریک ہوئے۔[۴] چھ دنوں

---

[۱] How I won the victoria Cross, London 1881, P.P. 125-26

[۲] How I won the victoria Cross, P.P 125-26

[۳] Mallison, III, P.P. 299-30 تاب صفحات ۶۶-۷ پر لکھتے ہیں کہ برکات احمد شاہ صاحب کے مرید تھے اور انھوں نے شاہ صاحب کو بصد منت جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کیا۔

تک محاصرہ چلتا رہا[1]۔ انگریزی محصورین نے بے پناہ جرأت اور استقامت کے ساتھ مدافعانہ جنگ جاری رکھی۔ اس جنگ میں بھی احمداللہ شاہ اور اُن کے رفقاء کے علاوہ اودھ کی فوج جرأت وہمت سے خالی تھی۔ بالآخر چھٹے دن احمداللہ شاہ سے برداشت نہ ہوسکا۔ جمعہ کا دن تھا۔ بقول کمال الدین حیدر:۔

"وقت عصر احمداللہ شاہ نے دھاوا کیا بیلی گارد کے زیر دیوار پھاٹک پر جا پہونچا۔ اُس وقت محصورین بیلی گارد کہتے ہیں کہ اوسوقت ہم سب کو یقین اپنی ہلاکت کا ہوگیا کس واسطے سپاہی گورے ہندوستانی جتنے مورچوں پر تھے کئی دن کے علی الاتصال لڑنے سے تھک گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں کی سب کی سکت جاتی رہی تھی.....اور موت ہر ایک کی نظر میں پھر گئی۔ شاہ جی پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کئے کہ بس اس حملے میں ان سب کا کام تمام ہے، مگر کسی کی جرأت قدم سے قدم بڑھانے کی نہ رہی[2]۔"

کمال الدین حیدر کے پورے بیان میں یہ بات واضح ہے کہ احمداللہ شاہ اور اُن کے رفقاء نے نہایت کامیاب حملہ کیا تھا لیکن ان کو مدد نہ مل سکی۔ بہرحال مدد نہ ملنے کا الزام اودھ کے اس مورخ نے خوبصورتی سے احمداللہ شاہ کے مجاہدین پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب کو اگر مدد ملتی تو وہ سپاہ اودھ سے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ احمداللہ شاہ کی ہر دلعزیزی اور عسکری صلاحیتوں سے امرائے لکھنؤ اور بالخصوص موخاں کو یہ فکر دامن گیر ہوچکی تھی کہ مبادا شاہ صاحب خود بادشاہت کا اعلان نہ کردیں۔ دوم اگر شاہ صاحب نے قیادت حاصل کرلی تو موخاں اور اُن کے دوسرے رفقاء کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ احمداللہ شاہ اور بیگم حضرت محل کے درمیان شکوک کی دیوار مضبوط کرنے کے لیے، آخرالذکر کے کان بھرے گئے، جُداگانہ مسلک کے اقتدار کا ہوّا کھڑا کیا گیا اور اس طرح حضرت محل اور شاہ صاحب کے درمیان نااتفاقی کی دیوار مضبوط کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیلی گارد کی مہم کے بعد فوج کی تقسیم ناگزیر ہوگئی۔ احمداللہ شاہ، ان کے رفقاء اور بہت سے باغی فوجی ایک طرف تھے اور دوسری طرف موخاں کے زیر اثر باقی ماندہ فوج۔

---

[1] کمال الدین حیدر، دوم صفحہ ۲۳۰۔ [2] کمال الدین حیدر، دوم ص۲۳۰، بیگمات اودھ کے خطوط سے بھی شاہ صاحب کے بیلی گارد کے پھاٹک تک پہنچنے اور زخمی ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ صفحات ۴۳-۴۴

آپس کے اختلاف کے باوجود، احمد اللہ شاہ انگریزوں کو بہر صورت لکھنؤ سے نکال دینا چاہتے تھے۔ اُن کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ باغیوں کو متحد رکھنا اور عسکری قوت کو مضبوط کرنا تھا۔

اسی زمانہ میں اودھ میں ایک رسالہ فتح اسلام کے نام سے شائع کیا گیا۔ رسالہ کے مطالعہ سے باغیوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالت کیا تھی۔ غالباً رسالہ فتح اسلام برجیس قدر کی مسند نشینی سے دو ایک دن پہلے شائع کیا گیا تھا۔ رسالہ کی زبان عام فہم مروجہ اردو ہے لیکن اس کا مصنف غالباً معمولی علمی صلاحیت کا فرد تھا۔ اس رسالہ میں انگریزوں کے مظالم کی داستان اور اُن کی ہندوستانیوں کے مذاہب کو برباد کرنے کی کوششوں کا ذکر ہے۔ بعدازاں اپیل کی گئی ہے کہ دشمن کے خلاف مورچے قائم کیے جائیں اور "باقی سپاہ بادشاہ کے حکم سے بلکہ خود درخواست کر کے پورب کی طرف روانہ ہوں اور غازی لوگ بھی ساتھ ہو جاویں اور جس طرح روم و شام کی گھٹا اٹھتی ہے اُسی طرح کافروں کو مارتے بھگاتے کلکتہ تک چلے جاویں تاکہ دہلی اور لکھنؤ کی پوری محافظت ہو سکے اور سب تدبیروں پر مقدم غازیوں کا جمع کرنا ہے[1]۔" رسالہ فتح اسلام میں مزید عوام کے جان و مال کے تحفظ کی اہمیت بتلانے کے بعد کہا گیا ہے کہ کفار پر فتح کی نعمت "تبھی حاصل ہوگی جب کسی کو امام مقرر کر کے جہاد قائم کریں گے[2]" اور ایک دوسری جگہ عوام کی رگِ حمیت کو جوش میں لانے کے لیے وضاحت کی گئی ہے کہ "بکٹوریہ (ملکہ وکٹوریہ) کافرہ اور دین کے دشمن انگریزوں کی تابعداری سے مسلمان امیر کی تابعداری اور بادشاہ کے تابعدار راجہ لوگوں کی تابعداری کئی کروڑ درجہ افضل ہے[3]۔"

رسالہ فتح اسلام میں امیر لشکر کے تقرر اور اُس کی قیادت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس رسالہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے:۔

"اور ہندو لوگ بھی اپنے دین کی محافظت کے واسطے امیر کے شریک ہو جاویں اور پکا قول اقرار کریں اور ہندو مسلمان دونوں بھائی انگریزوں کو کاٹیں کیونکہ اسے سابق اسلام کے بادشاہ نے ہندو لوگوں کے جان و مال اور بال بچوں کی محافظت کی طرح بموجب

---

[1] رسالہ فتح اسلام ص ۳ [2] ایضاً ص ۴ [3] ایضاً ص ۹

شرع کے اپنے ذمہ پر لازم کرلیا تھا اور سب ہندو دل وجان سے مطیع الاسلام اور بادشاہ کے خیرخواہ تھے۔ تو اب بھی وہی ہندو ہیں اور وہی مسلمان ہیں اور وہی کتاب ہے اپنے دین پر وے رہیں گے اور اپنے دین پر ہم رہیں گے۔ ہم ان کی مدد اور محافظت کریں گے وے ہماری مدد اور محافظت کریں گے۔"[1]

رسالہ فتح اسلام کا یہ پہلو بہت اہم ہے کیونکہ مندرجہ بالا سطور میں ان تاریخی حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے جس کی آج کل یکسر نفی کی جارہی ہے۔

رسالہ فتح اسلام میں جابجا 'جہاد' اور 'امام' کے تقرر پر زور دیا گیا ہے اور اس کے فوائد بتلائے گئے ہیں۔ ایک مقام پر یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جس شہر میں دو رئیس ہوں اور اُس کی حکومت اُس شہر میں ہے وہاں پر دوسرے امیر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایک مقام میں دو امیر قائم کرنا درست نہیں ہے۔"[2]

رسالہ فتح اسلام کی پوری عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی اشاعت غالبًا احمد اللہ شاہ کی مرضی کے مطابق تھی۔ چونکہ احمد اللہ شاہ کی زندگی کا سب سے بڑا مشن جہاد ہی تھا اس لیے رسالہ فتح اسلام میں جابجا جہاد کی اہمیت اور فضیلت پر زور دینا باعث تعجب نہیں ہے۔ قیادت کے لیے امام کے تقرر یا ایک شہر میں دو رئیس ہوں تو صرف ایک امام ہو' ایسے واضح مسائل ہیں جن پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اودھ کے معزول نواب کے امرا جنھوں نے برجیس قدر کی مسند نشینی میں حصہ لیا تھا اس کے لیے آمادہ نہ تھے کہ احمد اللہ شاہ کو قائد یا امام تسلیم کیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا سبب احمد اللہ شاہ کی ہر دل عزیزی اور پاک کرداری تھا۔ بہر نوع اس اختلاف کا نتیجہ سوائے بربادی کے اور کچھ نہ تھا۔ یہاں کواناگہ (Kavanaga) کا یہ بیان قابل توجہ ہے:۔

"مولوی (احمد اللہ شاہ) کا فوج پر بڑھتا ہوا اثر درباریوں کے لیے مزید خطرہ کا سبب بنا جو مولوی کی برتری کو ختم کرنے کے لیے، ناکام کوششوں میں مبتلا تھے۔ اُس نے (احمد اللہ شاہ) جرأت مند ہونے کی عظیم شہرت حاصل کرلی تھی جس سے محل کے حکام تہی دامن تھے۔ مذہب کی اساس پر کام کرتے ہوئے اُس نے فوج کا اعتماد حاصل

---

[1] رسالہ فتح اسلام، ص ۶ [2] ایضًا ص ۹

کرلیا تھا اور وہ اُن کا محبوب بن گیا تھا"[۹۰]

بہر حال برجیس قدر کی مسند نشینی کا ایک بُرا اثر یہ ہوا کہ فوج دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ احمد اللہ شاہ اور اُن کے رفقا ر آزادانہ طور پر انگریزی افواج کے خلاف مختلف معرکوں میں سرگرم عمل رہے، لیکن اختلافات کی وجہ سے باغی فوج کی قوت کمزور ہو رہی تھی۔ دریں اثنا جنرل اوٹرم ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج کے ساتھ محصورین بیلی گارد کی رہائی کو آن پہونچا۔ عالم باغ کے معرکہ میں احمد اللہ شاہ اور اُن کے رفقا ر نے دلیرانہ لیکن ناکام کوشش جنرل اوٹرم کی پیش قدمی روکنے کے لیے کی[۹۲]۔ عالم باغ کی ہزیمت کے بعد شاہ صاحب اور ان کے رفقا نے ایک اور ناکام کوشش جنرل اوٹرم کی لکھنؤ میں داخلہ کے خلاف کی۔ لیکن جنرل اوٹرم کی گولہ باری اور باغیوں کے اختلافات کی وجہ سے نہ صرف اوٹرم ۲۵ ستمبر کامیابی کے ساتھ لکھنؤ میں داخل ہوگیا بلکہ ۲۶ ستمبر کو بیلی گارد کے محصورین کو آزاد کرا کر لے جانے میں کامیاب ہوا[۹۳]۔ جنرل اوٹرم کے لکھنؤ میں داخلہ کے بعد احمد اللہ شاہ نواب علی نقی خاں کے مکان جو گنو گھاٹ پر واقع تھا، پناہ گزیں ہوئے شاہ صاحب نے واضح طور پر باغیوں کی ناکامی کا سبب نواب نقی علی کو برجیس قدر کی کمزور قیادت کو بتلایا[۹۴]۔

چند دنوں بعد جنرل اوٹرم بیلی گارد کے محصورین کو ساتھ لے کر کانپور چلا گیا، کیونکہ اس

---

۹۰ How I won the Victoria Cross pp. 130 - 32 ڈاکٹر وزیر خان جو آگرہ میں اسسٹنٹ سرجن تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مجاہدانہ حصہ لے رہے تھے، اپنے مقدمہ کے بیان میں احمد اللہ شاہ کے متعلق بتلایا کہ شاہ صاحب کمانڈر کی حیثیت سے اور اپنے بے داغ کردار، شجاعت اور دلیری کی وجہ سے اتنے مقبول تھے کہ بیگم حضرت محل نے اُن کی طاقت کم کرنے کے لیے ایک پارٹی تشکیل کی۔ ملاحظہ ہو Touigrir political procudings. National Archives, New Delhi Procudings, 30 Dec. 1859 No. 312

کمال الدین حیدر، دوم، صفحات ۶۷-۲۶۶، اور ۸۲-۲۸۱

۹۲ ذکاءاللہ لکھتے ہیں: "باغیوں کا بڑا مشہور اور لائق سرغنہ مولوی احمد اللہ تھا اس نے بڑی معقول تدبیریں اوٹرم صاحب کے نکالنے کی کی"۔ عروج عہد انگلشیہ، دوم ص ۵۶

۹۳ کمال الدین حیدر، ص ۲۲۹ اور ۲۷۱

۹۴ کمال الدین حیدر، دوم ص ۲۸۸، اس واقعہ کو بڑے استہزائیہ انداز میں لکھتا ہے۔

وقت لارڈ کیننگ گورنر جنرل کا حکم صرف محصورین کی رہائی ہی تھا۔[۱] لکھنؤ سے انگریزی فوج کے ہٹتے ہی پھر وہی دورِ بدامنی لوٹ آیا۔ موخاں اس کے بڑے ذمہ دار تھے۔ اُمرا، مہاجنان، نواب کے اعزہ، اور دوسرے صاحبِ ثروت لوگ اس لوٹ مار سے محفوظ نہیں تھے۔[۲] کمال الدین حیدر جو غالباً شاہ صاحب سے مسلکی اختلاف کی وجہ سے اُن کا بہت ناقد اور بعض مقامات پر استہزا سے بھی باز نہیں آتا لکھتا ہے:۔

"جب یہ صورتِ حال ہوگئی، آخر تنگ ہوکر اکثر مہاجنان و رعایائے شہر اس ظلم وستم سے احمداللہ شاہ کے پاس فریاد کو گئے کہ ہم پر جو یہ جور وستم ہو رہا ہے اگر راہ صاف ہوتی کہیں اور چلے جاتے۔ اگر نواب (برجیس قدر) سے نالش کرتے ہیں جواب دیتے ہیں کہ موخاں کے کام میں مجھے کوئی دخل نہیں، اگر ان کے پاس جاتے ہیں کوئی شنوائی نہیں کرتا بجز طلب زر کے۔ فقیر (احمداللہ شاہ) نے جواب دیا کہ اگر کوئی نوکر موخاں، یوسف خاں کا دوڑ لائے جس کے مکان پر، وہ فوراً ہمیں خبر دے یہاں سے تلنگے جاکر گرفتار کرلائیں گے اور میر شاہ جی نے پچاس ہرکارے مخبری کے لیے نوکر رکھے کہ جب کسی رعایا کے مکان پر دوڑ جائے، فوراً خبر کرو۔ چنانچہ بیس دن یا ایک مہینے تک یہی صورت رہی کہ جب دوڑ جاتی تھی، تلنگے پکڑ لاتے تھے۔"[۳]

مندرجہ بالا اقتباس سے جو ایک غیر مداح اور بڑی حد تک ایک خاص ذہن کے مورخ کے قلم سے ہے یہ بات ظاہر ہے کہ احمداللہ شاہ کا موخاں یا برجیس قدر کے مقابلہ میں کتنا اثر تھا۔ عوام کو یقین تھا کہ شاہ صاحب اُن کے تحفظ کا انتظام کردیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ تاہم احمداللہ شاہ کی موخاں کی غاصبانہ روش پر پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرالذکر نے اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں شاہ صاحب کے خلاف استعمال کرنی شروع کردیں۔ شاہ صاحب کے لکھنؤ سے اخراج اور قتل کی تدبیریں کی گئیں کیونکہ موخاں، شاہ صاحب کی لکھنؤ میں موجودگی کو اپنے لٹیرانہ طرزِ عمل اور مستقبل میں اقتدار کے لیے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ بہرحال موخاں کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں مو خاں کی فوج کے بہت سے افسران اور سپاہی، شاہ صاحب کے ساتھ آگئے۔ شاہ صاحب دوبارہ لکھنؤ میں داخل ہوگئے۔ شیش محل اور پھر چکروالی کوٹھی میں قیام پذیر ہوئے۔[۴]

۱۔ The Raj, the Indian Mutiny and the Kingdom of Oudh p. 195

۲۔ کمال الدین حیدر، دوم، صفحات ۲۹۸ – ۳۰۰ ۳۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۰ ۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۰

ایک جانب لکھنؤ میں نفاق کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں تو دوسری جانب انگریزی افواج کانپور، فتح گڑھ اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی ۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو جنرل اوٹرم چنہٹ کے قریب ایک زبردست توپ خانہ اور سات ہزار کی آزمودہ فوج کے ساتھ گومتی عبور کر کے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لکھنؤ میں افراتفری بپا تھی دریں اثنا جنرل اوٹرم کی مدد کے لیے مزید کمک سلطان پور سے آ گئی[1] احمد اللہ شاہ نے جنرل اوٹرم کی پیش قدمی روکنے کے لیے موضع ککڑال میں اپنا مورچہ قائم کیا۔ شاہ صاحب کو موخاں کی فوج سے کوئی توقع نہ تھی۔ احمد اللہ شاہ نے اس موقعہ پر موخاں کی فوج کو سمجھایا کہ وہ اُن کے ساتھ مل کر غنیم سے نبرد آزما ہوں۔ آپ نے موخاں کی فوج سے انتخاب کر کے دو پلٹنیں تیار کیں اور سب سے آخر دم تک لڑنے کی قسم لے لی[2] مگر فتنہ پردازوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ یہ خوف بھی دامن گیر ہوا کہ اگر احمد اللہ شاہ جنگ جیت گئے تو بہت قوت پکڑ لیں گے۔ چنانچہ ایک ایسے نازک وقت پر جبکہ دشمن دروازہ پر دستک دے رہا تھا اور ایک باصلاحیت، تجربہ کار فرد، دشمن کو پسپا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، زعمائے حکومت نے باقاعدہ مشورہ کر کے، اودھ کی فوج کو واپس لکھنؤ طلب کر لیا[3]۔ کمال الدین لکھتا ہے:۔

"یہ بھی اقبال صاحبان عالیشان کا تھا کہ آپس میں ہر روز بلکہ ہر وقت ایسے فساد چلے جاتے تھے کہ اگر احیاناً ایک بناتا تھا دوسرا اپنی بدنفسی سے بگاڑ دیتا تھا[4]۔"

ایسے ماحول میں اکیلے احمد اللہ شاہ اور اُن کے رفقاء کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ انگریزی فوج کی یلغار کو روک سکتے۔ شاہ صاحب کو ککڑال میں بھی شکست ہوئی، بچی کھچی فوج لے کر لکھنؤ میں داخل ہو کر سرائے معتمد الدولہ میں مقیم ہوئے[5]۔

دریں اثنا انگریزی فوج نے لکھنؤ کے چاروں طرف اپنا حلقہ تنگ کرنا شروع کیا۔ باغیوں نے مدافعت ضرور کی لیکن وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکے۔ احمد اللہ شاہ اپنے مجاہدین کے ہمراہ، دوسرے باغی فوجیوں کے ساتھ گنو گھاٹ پر مقیم ہوئے[6]۔ اسی دوران شاہزادہ فیروز شاہ بھی لکھنؤ آ چکے تھے۔ ان کی آمد سے احمد اللہ شاہ کے حوصلے بڑھے۔

۱؎ کمال الدین حیدر، دوم ص ۳۲۵　۲؎ ایضاً ص ۳۲۶　۳؎ ایضاً ص ۳۲۶
۴؎ ایضاً　۵؎ ایضاً　۶؎ ایضاً

مشترکہ طور پر دونوں نے انگریزی فوج کے خلاف معرکہ آرائی کی، لیکن ہزیمت اٹھانی پڑی لکھنؤ میں جہاں ایک طرف کشت وخون کا بازار گرم تھا، دوسری طرف بیگم حضرت محل معہ برجیس قدر کے بمشکل تمام جان بچا کر لکھنؤ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوسکیں۔

۳۰ رجب ۱۲۷۵ھ مطابق ۵ مارچ ۱۸۵۸ء کو بروز چہارشنبہ احمداللہ شاہ نے دوبارہ اپنے رفقاء کی معیت میں انگریزوں پر عیش باغ میں حملہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ شاہ صاحب کے شدید حملہ کی وجہ سے انگریزی فوج نہر عبور کرنے میں ناکام رہی۔ دوبارہ جب انگریزی فوج نے یلغار کی تو احمداللہ شاہ اور مجاہدین حملہ کی تاب نہ لا سکے کیونکہ وہ لوگ مستقل تین دن اور راتوں سے لڑتے لڑتے تھک چکے تھے[1] شاہ صاحب نے درگاہ حضرت عباس میں پناہ لی[2] بعد ازاں موضع باری ضلع سیتاپور میں منتقل ہوگئے اور از سر نو مجاہدین کی تنظیم میں مشغول ہوگئے۔ لکھنؤ سے فرار ہونے کے بعد بیگم حضرت محل اور اُن کے رفقاء بھی باری پہونچے۔ تاب لکھتے ہیں کہ بیگم حضرت محل اور برجیس قدر نے شاہ صاحب کی بیعت کرلی[3] کمال الدین حیدر حضرت محل اور برجیس قدر کی بیعت کا ذکر تو نہیں کرتا، تاہم رقم طراز ہے:۔

"بعض امراء نے بخوف غارت گری شاہ جی کا پیالہ پیا، بیعت بھی کی"[4]

بہرنوع بیگم حضرت محل اور برجیس قدر کی بیعت مشتبہ ہے، کیونکہ بیعت کے بعد احمداللہ شاہ کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا اور خود بیگم کی اپنی سیاسی حیثیت بہت کمزور ہوجاتی۔ دوسرے بیعت کا معاملہ اتنا اہم تھا کہ مسلکی طور پر غالب مذہبی فرقہ کے رہنما اسے آسانی سے قبول نہ کرتے ہوئے ہیں اُن کا کوئی ردِعمل بھی نہیں ملتا جس سے واضح ہوتا ہے کہ بیعت کا معاملہ درست نہیں ہے۔

یہ امر قابل داد ہے کہ پیہم ہزیمتوں کے باوجود احمداللہ شاہ کے استقلال میں فرق نہیں آیا۔ باڑی میں اُن کے ساتھ ایک بڑی جمعیت اکٹھا ہو چکی تھی جنرل بخت خاں بھی ان کے ساتھ مل چکے تھے لیکن

---

[1] Foreign Political Proceedings, dated 30 Dec. 1859, Pt. II, No. 1491 Cons. No, 313 NAI, New Delhi

میلی سن، جلد چہارم، ص ۲۸۶، کمال الدین حیدر، جلد دوم، ص ۳۳۶

[2] کمال الدین حیدر، جلد دوم، صفحہ ۳۴۴؛ تاب صفحات ۹۲-۹۰ [3] تاب، ص ۹۱

[4] کمال الدین حیدر، دوم، ص ۳۴۷

افراد کی کثرت اس بات کی ضامن نہیں تھی کہ تمام لوگ تجربہ کار اور جنگجو سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں کے حوصلے لگاتار فتح کے بعد کافی بلند تھے۔ انگریزوں کی مصلحت یہ تھی کہ باغیوں کو دوبارہ منظم نہ ہونے دیا جائے، خاص طور پر جنرل بخت خاں کی احمد اللہ شاہ کی معیت میں ہونا، ان کے لیے فوجی نقطۂ نگاہ سے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کپتان ہوپ گرانٹ کو حکم ملا کہ وہ احمد اللہ شاہ کے خلاف یورش کرے[۱]

احمد اللہ شاہ کی صحت مستقل معرکہ آرائیوں سے بُری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ اُن کی پشت پر سرطان کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ شاہ صاحب اس عالم میں بھی دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے، انھیں ہوپ گرانٹ کی پیش قدمی کی پوری اطلاع مل چکی تھی۔ شاہ صاحب نے کھلے میدان میں جنگ کی بجائے گوریلا جنگ کو ترجیح دی۔ انگریزی فوج کی کیفیت معلوم کرنے کے بعد، باڑی سے تقریباً ۴ میل دور ایک گاؤں کے قریب جس کے سامنے سے ندی بہتی تھی، اور کنارے کافی اونچے تھے، شاہ صاحب نے اپنی فوج کی کمین گاہ بنائی تھی کہ اچانک حملہ کر کے انگریزی فوج کو زیر کر لیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے شاہ صاحب کی فوج کے بعض سپاہیوں نے منصوبہ کے خلاف انگریزی فوج پر حملہ کر دیا اور نقشہ ہی بدل گیا۔ شاہ صاحب کی فوج کو شکست ہو گئی اور بہت سے افراد شہید ہو گئے۔ گمان غالب ہے کہ شاہ صاحب کی پے در پے شکستوں میں اُن منافقوں کا ہاتھ تھا جو اُن کی فوج میں شریک ہو کر کام کر رہے تھے[۲]۔

باڑی کی شکست کے بعد احمد اللہ شاہ باقی ماندہ فوج کے ہمراہ محمدی (ضلع لکھیم پور کھیری) چلے گئے۔ آلاتِ حرب کی کمی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ فوج کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ جدید آلاتِ حرب کا حصول بہت مشکل تھا۔ احمد اللہ شاہ نے، خان بہادر والیٔ بریلی کو بھالوں کی ترسیل کے لیے لکھا، پیشگی رقم بھی قاصد کے ساتھ کر دی لیکن بریلی میں بھی منافقین کی کمی نہ تھی۔ وہ احمد اللہ شاہ کی مقبولیت سے خائف تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کی درخواست اس بنا پر رد کر دی گئی کہ بریلی میں خود بھالوں کی ضرورت ہے[۳]

---

[۱] میلی سن، جلد چہارم، ص ۴۸ – ۳۴۷

[۲] ابرار حسن فاروقی صاحب نے بھی منافقین کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ مآثر دلاوری، ص ۱۲۹

[۳] تائب، ص ۹۹ – ۹۱

شاہ صاحب کے محمدی پہنچنے کے بعد، آہستہ آہستہ یہ مقام شکست خوردہ باغیوں کی پناہ گاہ بنتا جا رہا تھا۔ احمد اللہ شاہ کی انگریزوں کے خلاف مستقل جنگ آزمائی کے سبب غالبًا اُن کے ہم عصر باغیوں کو ایک ایسی شخصیت نظر آ رہی تھی جس سے صلاح مشورہ کر کے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی۔ مرہٹہ سردار نانا راؤ[۱] اُن کے معتمد خاص عظیم اللہ خاں[۲]، شہزادہ فیروز شاہ[۳] محمدی میں اکٹھا تھے[۴]۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا کہ محمدی میں پھر قیادت کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آیا۔ لکھنؤ میں احمد اللہ شاہ نے برجیس قدر کی قیادت صرف اس لیے نہیں قبول کی تھی کہ وہ طفل نادان تھے محمدی میں دوسرا مسئلہ تھا۔ یہاں احمد اللہ شاہ کے علاوہ نانا راؤ اور فیروز شاہ دونوں ہی قائد تسلیم کیے جا سکتے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ اور نانا کے مقابلہ میں احمد اللہ شاہ زیادہ ہر دل عزیز تھے۔ دوم احمد اللہ شاہ ایک ایسے علاقہ میں تھے جس کے قرب و جوار کے اضلاع میں پٹھانوں کی زبردست آبادی تھی، پٹھانوں کے لیے نانا راؤ اور فیروز شاہ کے مقابلے میں شاہ صاحب کی قیادت زیادہ پرکشش تھی۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ قائد ایسا فرد ہو جو تجربہ اور عمر کے لحاظ سے بھی برتر ہو۔ بہر نوع احمد اللہ شاہ کی قیادت میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا' آپ کی باقاعدہ بادشاہت کا اعلان ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو کر دیا گیا[۵]۔ شاہ صاحب کی بادشاہت

---

[۱] آخری پیشوا باجی راؤ دوم کے متبنیٰ تھے۔ باجی راؤ دوم کی موت کے بعد انگریزوں نے نانا راؤ کو اُن کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو، کنھیا لال، محاربہ عظیم، نول کشور، ص ۱۱۸

[۲] حیات کے لیے ملاحظہ ہو ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۶۱ — ۴۳

[۳] حیات اور ۱۸۵۷ء میں کارناموں کے لیے ملاحظہ ہو، Bengal Past and Present 1969
۱۸۵۷ء کے مجاہد، صفحات ۲۸ — ۱۲۰، شہابی، ص ۴۴

[۴] ذکاء اللہ صاحب بیگم حضرت محل کی موجودگی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ عروج عہد انگلشیہ، ص ۹۰ تائب ص ۱۰۶ پر لکھتے ہیں کہ خان بہادر خاں اپنی ۱۶ ہزار فوج کے ساتھ محمدی میں موجود تھے جو درست نہیں معلوم دیتا۔ ملاحظہ ہو راقم کا مضمون The Rebellion in Bareilly - Role of the local gentry (under publication)

[۵] تائب ص ۱۰۵ کمال الدین حیدر، دوم صفحہ ۳۴۷ اور ۳۶۷ پر لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ شاہزادے سے اسی اعلان بادشاہی پر بگاڑ ہوا۔

کے اعلان کے پس پشت غالباً یہ نفسیاتی شعور بھی کام کر رہا تھا کہ دہلی کا آخری مغل بادشاہ انگریزوں کی قید میں وطن سے دور رنگون میں زندگی کے آخری دن کاٹ رہے تھے۔ بیگم حضرت محل نیپال کی سرحد کے قریب بھٹک رہی تھیں اور ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ ایک نام پر جمع کرنے کے لیے لفظ "بادشاہ" میں بڑی کشش تھی۔ دوسرا پہلو نفسیاتی تھا۔ اس طرح قرب وجوار کے زمین داروں کو انگریزوں سے برگشتہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانی بادشاہ سے فتح کے بعد زیادہ انعام واکرام کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بہر حال بادشاہت کے اعلان کے بعد سکے ڈھالے گئے جس پر یہ شعر کندہ تھا:۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیٔ دینِ محمد، احمد اللہ بادشاہ

بادشاہت کے اعلان کے بعد احمد اللہ شاہ نے بہت سے نوابین، راجگان، ناظمان وچکلہ داران کے نام فرامین وحکمنانے جاری کیے گئے تھے ایام غدر میں بہت سی ایسی دستاویزات ضائع ہو گئیں، بہر حال جو محفوظ رہ گئی ہیں اُن سے احمد اللہ شاہ کی انتظامی صلاحیتوں کی جھلک ضرور مل جاتی ہے۔

ایک حکمنامہ جو مہارانی چندکور، والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ، لاہور کے سفر کے متعلق ہے خاصہ دل چسپ ہے۔ اس حکم نامہ مورخہ ۷ ارمحرم الحرام ۱۲۷۴ھ میں شاہ صاحب نے تمام نوابین، راجگان، ناظمان، چکلہ داران اور زمینداران از نیپال تا لاہور کو، ہدایت کی تھی کہ مہارانی مذکورہ کو بحفاظت منزل مقصود تک خاطر مدارات کے ساتھ پہونچائیں اس حکمنامہ کی آخری سطور خاص طور پر لائق توجہ ہیں:۔

"...... کہ باعث خوشنودی ما یہ دولت ونیک نامی وخیر سگالی شاں خواہد شد وچوں خدائے عزوجل حضور ما بدولت "خلیفۃ اللہ فی ارض اللہ" برائے آسائش وآرام کافہ بنام برگزیدہ است۔ بنا ءعلیہ پاس خاطر ہر خاص وعام از ضروریات وتعمیل حکم، برایشاں از واجبات ودرصورت بجا آوری اوامر مندرجہ حکم نامہ ہذا بہ جلد دے ایں حسن کرداری خود ہا را مورد تحسین وآفریں خواہند پنداشت[۲]"

---

[۱] پیر احمد اللہ شاہ، کمال الدین حیدر نے ص۲۶ پر پورا شعر لکھا ہے۔

[۲] مآثر دلاوری، ص۱۴۳-۱۴۵ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شاہ صاحب کا حکم نامہ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء =

RAYAZ AHMED SHERIFF
25/3. MARAPPA THOTA.
M. R. PALYAM BANGALORE

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ احمد اللہ شاہ کی بادشاہی بحیثیت خلیفۃ اللہ کے تھی جو مخلوق کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ دوسرا اہم پہلو اس حکم نامہ کا یہ ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ ان کی عملداری نیپال کی حدود تا پنجاب ہے، تمام راجاؤں، نوابوں اور دیگر افراد کو تعمیل حکم کی ہدایت کی تھی بہر حال محمدی میں شاہ صاحب کی نئی پوزیشن نے انگریزوں کو بہت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اُنھوں نے شاہ صاحب کی گرفتاری کے لیے پچاس ہزار روپئے کی رقم کا اعلان کر دیا۔[1]

احمد اللہ شاہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ فوج کی مکمل تنظیم کا تھا، اس کے لیے مالی وسائل کی ضرورت تھی۔ اب تک شاہ صاحب کس طرح فوج کا کام چلا رہے تھے، اس کا صاف طور سے پتہ نہیں چلتا گمانِ غالب یہ ہے کہ اُن کی معاونت اودھ اور قرب وجوار کے تعلقہ دار اور زمیندار کر رہے تھے، جو اب بھی شاہ صاحب کے لیے نہ صرف مالی امداد کا ذریعہ تھے بلکہ انگریزوں اور اُن کے حلیف ہندوستانیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع بھی شاہ صاحب کو دے رہے تھے۔[2]

احمد اللہ شاہ کے حکم ناموں کا اثر دور دور تک تھا۔ بارہ بنکی اور لکھنؤ کے بعض تعلقہ دار اور زمیندار شاہ صاحب کے حلیف تھے اور اُن کی معاونت کر رہے تھے[3] اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے بڑی ذہانت سے اودھ کے تعلقہ داروں کی اعانت حاصل کرنے کے لیے یہ اعلانیہ بھی جاری کر دیا تھا کہ اُن تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں پر اُن کے علاقوں کی نصف جمع اُن کو دے دی جائے گی جو اپنے اپنے علاقوں میں انگریزوں سے جنگ کریں گے

= مطابق ۱۷ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کا جاری ہوا تھا، گویا کہ بادشاہت کے اعلان سے بہت پہلے، اس وقت غالباً شاہ صاحب خود کو خلیفۃ اللہ ہی کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔

۱۔ رضوی، جلد پنجم، ص ۵۳۹ ۲۔ رضوی، جلد دوم، صفحات ۶۸ ـ ۳۶۷

۳۔ ملاحظہ ہو علی محمد خاں کا خط بنام احمد اللہ شاہ، مورخہ ۲۶ راپریل ۱۸۵۸ء، دل جیت سنگھ تعلقہ دار بدہی پور کے خطوط بنام احمد اللہ شاہ مورخہ ۲،۴ راپریل ۱۸۵۸ء قادر بخش کا خط بنام احمد اللہ شاہ، مورخہ ۳ راپریل ۱۸۵۸ء، سید کاظم علی کے خطوط بنام احمد اللہ شاہ مورخہ ۳ راپریل، ۴ راپریل، ۵ راپریل، ۶ راپریل و ۷ راپریل ۱۸۵۸ء محفوظہ رائے بریلی کلکٹریٹ میوٹنی بستہ۔

یا انھیں قتل کر دیں گے[۵۱] اس اعلانیہ کا کتنا اثر ہوا، بتلانا مشکل ہے، تاہم انگریزوں نے بھی اودھ کے تعلقہ داروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی اعلانیے جاری کیے تھے جس کی وجہ سے تعلقداروں کی بڑی تعداد اُن کی حلیف بن گئی تھی۔ احمد اللہ شاہ کو انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوجی سرگرمیوں سے یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر وہ کسی ایک جگہ مقیم رہے تو ان کے اور اُن کے رفقا کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے، اپنی بیماری کے باوجود وہ اپنا مستقر تیزی سے بدلتے رہے، شاید یہ بھی مصلحت رہی ہو کہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کا دورہ کر کے لوگوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا جا سکے اور زمینداروں و تعلقہ داروں کو یہ احساس دلا دیا جائے کہ ان کا بادشاہ ایک فعال اور باخبر شخص ہے۔ شاہ صاحب کی اس متحرک حکمت عملی نے انگریزوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہ شاہ صاحب کے صحیح مستقر کے متعلق کوئی مستند معلومات نہ رکھ سکے۔ وہ شاہ صاحب کی سفر کی سمت سے بھی واقفیت حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ ذیل کی سطور سے کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب ۲۸ ر اپریل کو خیر آباد میں تھے۔ ۳۰ ر اپریل کو شاہجہاں پور پر کولن کیمبل کی خبر سنی تو اس طرف روانہ ہو گئے، ۲ ر مئی کو کیمبل بریلی کی طرف کوچ کر گیا، شاہ جہاں پور خالی تھا، شاہ صاحب نے شاہ جہاں پور پر حملہ کر دیا لیکن ان کے رفقا کی تساہلی سے بروقت انگریزوں کو حملہ کی اطلاع مل چکی تھی[۵۲] چنانچہ نگراں انگریز آفیسر *Hale* نے اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ خود کو جیل کی عمارت میں محصور کر لیا۔ احمد اللہ شاہ کا شہر اور قلعہ پر قبضہ تو ہو گیا لیکن یہ عارضی ثابت ہوا۔ ۱۱ مئی کو بریگیڈیر جونس، ہیل کی مدد کو آ گیا[۵۳] احمد اللہ شاہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی، بریگیڈیر جونس نے کامیابی کے ساتھ ہیل سے رابطہ قائم کر لیا جو اب بھی جیل میں محصور تھا۔ احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں اور شدید جنگ کے پیش نظر جونس نے بریلی سے مدد طلب کی۔ احمد اللہ شاہ اس دوران بھی اپنا مستقر برابر تبدیل کرتے رہے۔ ۱۶ ر مئی کو وہ شاہجہاں پور سے چھ میل مشرق میں واقع اجونا تا ر میں مقیم تھے۔ ۱۷ ر مئی کو وہ لودی پور، شاہجہاں پور کے مضافات

---

[۵۱] ایک تعلقہ دار کا خط بنام احمد اللہ شاہ، لکھنؤ کلکٹریٹ میوٹنی بستہ، اعلانیہ گورنر جنرل، مورخہ ۲۸ ر مئی ۱۸۵۸ء، نمبر ۵۸۰، فارن ڈپارٹمنٹ (سیکرٹ) الٰہ آباد آرکائیوز، [۵۲] تاپ ص ۵–۱۰۲

[۵۳] *Foreign Department, North west Provinces, Record Room Lucknow, Russel, PP. 138-47*

میں تھے[1] سی آر لنڈ سے نے اپنے ایک برقی مراسلہ مورخہ ۲۱ مئی ۱۸۵۸ء کے ذریعہ لیڈ کو مطلع کیا کہ شاہ صاحب پالی پر قبضہ کر چکے تھے۔ اُن کے ہمراہ ۴ رجمنٹ پیدل فوج کی اور ۳ رجمنٹ گھڑ سوار فوج کی اور نو عدد توپیں تھیں[2] ۱۸ مئی ۱۸۵۸ء کو بہرحال شاہ صاحب کا انگریزی فوج سے شاہجہاں پور سے پانچ میل مشرق واقع موضع بنّی کے قریب تصادم ہوا۔ شاہ صاحب کو پھر شکست ہوئی اور وہ کل پانچ سو رفقا کی معیت میں سانڈی پہونچے[3] اب صورتِ حال باغیوں کے بالکل خلاف ہو چکی تھی۔ تاہم احمد اللہ شاہ کو اب بھی قرب وجوار کے تعلقہ داروں اور زمین داروں کا تعاون مل رہا تھا۔ شاہ صاحب باغیوں کی مدد کے لیے گرد و پیش کے راجاؤ اور زمین داروں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے ان میں پوائن (شاہجہاں پور) کا راجہ جگنا تھ سنگھ بھی شامل تھا۔ اُس کا بھائی بلدیو سنگھ بقول تائب شاہ صاحب کی فوج میں شامل تھا اور اپنے بھائی کے خلاف ایک فرضی قضیہ بیان کر کے مدد کا طالب تھا، لیکن اس فرضی قضیہ کے بہانے دراصل شاہ صاحب کو گرفتار یا قتل کرنا تھا، کیونکہ اودھ میں صرف شاہ صاحب ہی کی شخصیت تھی جو اب تک تمام تر زحمتوں اور شکستوں کے باوجود انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی۔[4] اس سلسلہ میں مولوی فضل حق خیر آبادی جو احمد اللہ شاہ کی رفاقت میں شاہجہاں پور میں موجود تھے، اصل صورت حال کی طرف روشنی ڈالی ہے:۔

> "اُدھر اس نیک سرشت بہادر عامل (احمد اللہ شاہ) سے ایک دیہاتی کافر زمیندار (جگناتھ سنگھ) نے بڑا داؤ کھیلا۔ اُس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لیکر وہ مدد کو پہونچے گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر اعتبار کر کے اس دیانت دار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔"[5]

مولوی صاحب کا اشارہ غالباً جنگ بنّی سے ہے جس میں پوائن کے راجہ نے مدد کا وعدہ

---

[1] سی۔ آر۔ لنڈ سے بنام ریڈ۔ مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۵۸ء محفوظہ سکریٹریٹ ریکارڈ روم، لکھنؤ۔ [2] ایضاً

[3] ایڈمانسٹن کا برقی مراسلہ بنام ریڈ، مورخہ ۲۱ مئی ۱۸۵۸ء، سکریٹریٹ ریکارڈ روم، لکھنؤ۔

[4] تائب، ص ۱۱۳-۱۶

[5] الثورۃ الہندیہ (عربی) ترجمہ اردو باغی ہندوستان، محمد عبدالشاہد خاں شروانی، ص ۱۴

کیا ہوگا۔ بہرحال مولوی فضل حق کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ شاہ صاحب نے راجہ پوائں پر حملہ کر دیا ہے کے نتیجہ میں وہ ایک طرف انگریزی فوج اور دوسری طرف راجہ کی فوج کے درمیان پھنس کر شہید ہو گئے[۱] یہ بات شاہ صاحب کی جنگی مہارت اور تجربات کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے، اس ضمن میں کمال الدین حیدر کا بیان قابلِ توجہ ہے:۔

> "اپنی جوشش ولولے سے تنہا اجل پوائے (پوائں) میں لے گئی۔ اپنی نخوت اور غرور سے تنہا معہ دو تین سواروں کے گیا۔ بہت بھروسہ اپنی کرامات کا رکھتا تھا۔ راجہ کی گڑھی کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہوا۔ پھاٹک بند تھا نہ کھولا۔ سخت گفتگو اپنے ولولے سے کرنے لگا۔ چمار نے رندے سے گولی ماری گر پڑا، راجہ نے سر کاٹ کر سرکار میں بھیجا"[۲]

کمال الدین حیدر نے یہاں بھی شاہ صاحب پر طنز کرنے سے نہیں چوکا تاہم اس کا یہ بیان درست ہے کہ شاہ صاحب صرف دو تین افراد کے ہمراہ ہی راجہ پوائں کے قلعہ پر پہونچے تھے۔ اس کی تصدیق جی۔پی۔ مونی مجسٹریٹ شاہجہانپور کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے[۳]

دراصل احمد اللہ شاہ کو راہ سے ہٹانے کے لیے، انگریز افسر بے حد متفکر تھے۔ مونی (Mony) مجسٹریٹ شاہجہاں پور، ضلع میں آنے کے بعد ہی سے اس فکر میں تھا۔ راجہ پوائں جو پہلے ہی سے انگریزوں سے بہت قریب تھا[۴] اس کو اس کام کے لیے مونی نے تیار کرنا شروع کیا جب مونی کو یہ خبر ملی کہ محمدی سے مجاہدین پوائں کی طرف جانے والے ہیں تب اس نے راجہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھا کر، مولوی (احمد اللہ شاہ) کو گرفتار کر کے انگریزوں سے اپنی وفاداری ثابت کر دے۔ چنانچہ یہی ہوا[۵] مونی کے بیان سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب کے خلاف سازش ہو رہی تھی۔ شاہ صاحب اس سازش سے آگاہ نہ تھے، دوم انھیں کسی خاص سبب سے راجہ پوائں سے غداری کی امید نہ تھی ورنہ دو چار آدمیوں کے ساتھ پوائں کے قلعہ کے پھاٹک پر جانے کا کیا سوال تھا۔ بہرحال شاہ صاحب شہید کر دیے گئے، اُن کا سر قلم کر دیا گیا۔ سر اور لاش شاہجہانپور شناخت کے لیے بھیج دیے گئے، جہاں دنیا کو تہذیب کا

۱؎ ایضاً ۲؎ کمال الدین حیدر، دوم ص۳۴۷

۳؎ Department XVIV, File No, 22. Mutiny Ricords, U.P. Archives Allahbad

۴؎ ایضاً ۵؎ ایضاً

درس دینے والی قوم کے اکابرین کے ایما پر لاش کو نذر آتش کر دیا گیا اور راکھ ندی میں بہا دی گئی سر کو کوتوالی کے سامنے ایک کھمبے سے عوام کی نمائش کے لیے لٹکا دیا گیا[۱] اس طرح انگریزوں نے احمداللہ شاہ کی حب الوطنی اور مذہبی جنگ کا بدلہ لیا۔

شاہ صاحب کی شہادت کی خبر سن کر بہت سے تعلقہ دار برہم ہوئے اور انھوں نے راجہ پوائن کو غداری کی سزا دینے کے لیے تیاریاں شروع کیں۔ لیکن راجہ جس کی وفاداری، شبہ سے بالاتر ہو چکی تھی، کی مدد کے لیے انگریزوں سے نولس (Nolice) کی قیادت میں فوج بھیج دی۔ نولس کی مدد کے لیے لفٹنٹ دوکانزو کی قیادت میں ایک گھڑسوار فوج بھی روانہ کر دی گئی[۲] ظاہر ہے کہ تعلقہ داروں کی طاقت سے باہر تھا کہ وہ انگریزی فوج کا مقابلہ کر پاتے۔ بالآخر راجہ پوائن کو انگریزوں نے انعام واکرام کے علاوہ تحفظ بھی مہیا کیا۔

احمداللہ شاہ اودھ اور روہیلکھنڈ میں واحد باغی رہنما تھے، جو آخر دم تک انگریزوں سے برسرپیکار رہے، آپ کی شہادت کے بعد کوئی ایسا باقی نہ رہا جو اس عزم محکم کے ساتھ انگریزوں کے خلاف صف آرا رہتا۔

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت یا جنگ آزادی کے دوران احمداللہ شاہ اپنی بے مثال بہادری اور اولوالعزمی، پاک کردار، عسکری صلاحیتیں اور انتظامی دور اندیشی کی وجہ سے اپنے دور کے دوسرے باغی رہنماؤں کے مقابلہ میں کافی اونچے مقام پر نظر آتے ہیں، اگر شاہ صاحب کے ساتھ اودھ کے ارباب حل وعقد نے تعاون کیا ہوتا، تو ممکن تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا دوسرا نتیجہ ہوتا۔

Malleson شاہ صاحب کو خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :-

"اگر محب وطن اسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لیے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محب وطن تھا اس نے اپنی تلوار کو قتل کے داغ سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اُس نے قتل کے کسی بھی واقعہ سے چشم پوشی گوارا نہ کی۔ وہ اُن بیرونی لوگوں کے خلاف مردانگی بلند ہمتی اور استقامت سے میدان جنگ میں لڑتا رہا جو اس کے وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اُس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں کی جانب سے عزت واحترام کی مستحق ہے[۳]۔"

بہر حال شاہ صاحب نے اپنی جرأت اور پیہم جد وجہد کا ایک اعلیٰ نمونہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑا جو قابل تقلید ہے۔

۱۔ ایضاً ۲۔ Foreign Department, North west Provinces, 1858 events for Shahjahanpur, 20th Secretarait Record office Lucknow

۳۔ Malleson, IV, P. 381.